باب سوم

حیرت انگیز لیفٹیننٹ

۲ فیلڈ رجمنٹ برطانوی ہندوستان کی وہ واحد رجمنٹ تھی، جس کے سارے سپاہی مسلمان تھے۔ ۱۹۴۴ء میں برما کے محاذ پر اپنے کمانڈر کی اچانک موت پر حادثتاً ایک معرکے میں قیادت کے فرائض انجام دینے والے اور ملٹری کراس حاصل کرنے والے کیپٹن راجہ محمد اسلم اس یونٹ کے واحد مسلمان افسر تھے۔ کیپٹن اسلم بعد میں پاکستانی فوج کے میجر جنرل بنے۔ وہ ان دنوں اپنے منصب سے ریٹائر ہو کر نیشنل پارک راولپنڈی کے عقب میں یادوں کے دن بسر کر رہے ہیں۔ گزرے دنوں کی بے شمار یادیں ان کے توانا حافظے میں محفوظ ہیں اور جب وہ گفتگو پر آمادہ ہوں تو ٹھیرے ہوئے لہجہ میں دیر تک ان یادوں کو ایک دمک اور افتخار کے ساتھ دہراتے ہیں۔

برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تو ۲ فیلڈ رجمنٹ، جس کا پرانا نام ۱۳ انڈین فیلڈ یونین تھا، پونا سے ۸۰ میل دور ڈھونڈ کے مقام پر متعین تھی۔ ایک روز کیپٹن اسلم کو یکا یک حکم ملا کہ وہ اس رجمنٹ کو لے کر راولپنڈی چلے جائیں کہ اب اسے پاکستانی فوج کا حصہ بننا ہے۔ رجمنٹ کے سکھ اور ہندو افسر دوسری یونٹوں سے وابستہ ہونے جا رہے تھے اور ان کا انگریز کمانڈنگ افسر (سی او) واپس برطانیہ جا رہا تھا۔ راجہ اسلم نے اپنے سات آٹھ سو جوانوں کو ایک خصوصی گاڑی میں سوار کرایا، کھلی بوگیوں میں توپیں نصب کیں اور راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ ۲ رجمنٹ فیلڈ کو جو بعد ازاں باؤنڈری کمیشن کی مدد کرنے والے دستوں کا حصہ بنی، یہ سفر پانچ دنوں میں طے کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں پانچ ہفتے صرف ہو گئے۔ راستے میں گاڑی پر تین بار حملہ ہوا۔ پاکستانی سرحد کے قریب اسے روک کر اس کے جوانوں کو غیر مسلح کر کے امرتسر لے جانے کی ایک سازش کی گئی کہ ایک سالم اور مسلح رجمنٹ کے پاکستان پہنچنے کا تصور بھارتیوں کے لیے اذیت ناک تھا۔ لیکن راجہ اسلم کسی طرح لڑتے بھڑتے راولپنڈی پہنچ گئے، جہاں چھاؤنی میں الو بول رہے تھے۔

ویسٹرج میں راولپنڈی کے شہریوں نے اپنی فوج کے پہلے دستے کا استقبال بھنگڑا ڈالتے اور ڈھول بجاتے ہوئے کیا۔ وہ جوانوں میں گھل مل گئے، ان کے گلے ملے اور ان میں سے بہت سوں نے بے تابی سے سوال کیا کہ وہ اپنے مہمانوں کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ جوان خالی پڑے کوارٹروں میں پناہ گزین ہوئے اور راجہ اسلم نے پشاور روڈ پر خالی پڑے ایک آرمی میڈیکل کور کے میس پر 'قبضہ' جما لیا۔ جلد ہی ایک انگریز کرنل مسٹر بلڈف نے رجمنٹ کی کمان سنبھالی اور وہ منصب پر کیے جانے لگے، جو ہندو اور سکھ افسروں کے چھوڑ جانے سے خالی ہو گئے تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ چشتی نام کے ایک افسر نے انہی دنوں رجمنٹ میں حاضری دی، جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے، 5 جولائی 1977ء کے فوجی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا، صدر ضیاالحق کے دست راست بنے، پھر نکالے گئے اور بعد میں وعدہ معاف بننے کی کوشش کرتے پائے گئے۔

ایک روز راجہ محمد اسلم کے کمرے کا دروازہ کھلا، جواب کیپٹن سے میجر بنا دیے گئے تھے، ایک گورے چٹے افسر نے زمین پر پاؤں پر جما کر انہیں

زوردار سیلیوٹ پیش کیا۔ پہلی نظر میں تو میجر اسلم کو دھوکہ ہوا کہ وہ نووارد ایک غیر ملکی ہے، لیکن پھر انہیں اس کے کندھے پر ایک ستارہ دکھائی دیا، یہ تو پاکستانی فوج کا سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ نووارد آگے بڑھا، اس نے شستہ لیکن مضبوط لہجے میں کہا، ''سر، میرا نام اختر عبدالرحمٰن ہے۔''

ریٹائرڈ میجر محمد اسلم کو، جو راولپنڈی کی سپاہ گر جننے والی دھرتی سے تعلق رکھتے تھے، اختر عبدالرحمٰن کے ساتھ گزرے دن خوب اچھی طرح سے یاد ہیں، جو کبھی ان کا ماتحت تھا، پھر ترقی کرتے کرتے ان کا ہم مرتبہ میجر جنرل بنا، اس کے بعد لیفٹیننٹ جنرل، پھر چار ستاروں والا جرنیل، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی بنا اور تاریخ کے صفحات پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ گیا۔ جنرل اسلم فوج میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کے اولین سالوں کا تذکرہ احساس فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہیں اس کا بہت مان ہے کہ ''جانے والا ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی۔'' انہوں نے کہا، ''وہ میرا احترام کرتے تھے اور اگر کبھی میں ناراض ہو جاتا تھا، تو وہ مجھے منا لیا کرتے تھے۔'' بوڑھے جرنیل سے گفتگو کرتے ہوئے، جن کے اندر کا سپاہی گفتگو میں بروئے کار رہتا ہے، انتہائی سخت گیر افسر کی بجائے جو شہید جرنیل کے بعض ماتحتوں کی یادوں میں ثبت ہے، ایک وضع دار آدمی کا چہرہ اجاگر ہوتا ہے۔ وضع دار اور بڑوں کے سامنے مودب ۔ ''اس نے برے وقتوں میں اچھے کام کیے''، جرنیل نے کہا، اور اس کے لہجے میں اداسی آ گئی، ''اب کس سے اس اعلیٰ معیار کی توقع کی جائے گی۔''

میجر اسلم کی رجمنٹ کو ایک چیلنج اور غیر یقینی حالات کا سامنا تھا۔ ان کے پاس افسروں کی کمی تھی، جو تعداد میں پانچ ہونے چاہییں تھے۔ لہٰذا ان کے نووارد ماتحت پر کام کا بہت بوجھ آ پڑا تھا، لیکن انہوں نے جو ماتحتوں کو شیر کی نظر سے دیکھنے والے فوجی افسروں میں سے ایک تھے، جلد ہی محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ ایک محنتی آدمی ہے اور اس میں سیکھنے کا جذبہ اور صلاحیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ ''اس کے اندر بڑا آدمی بننے کی صلاحیت جھلک رہی تھی۔''

1948ء میں ایک روز بریگیڈ کمانڈ سے پیغام موصول ہوا کہ حسن ابدال کے گوردارہ پنجہ صاحب میں ڈٹے ہوئے سیکڑوں سکھوں کو غیر مسلح کر کے انہیں بھارت روانہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ حسن ابدال کا یہ گوردارہ سکھوں کے تاریخی مقامات میں سے ایک اور ان کا ایک اہم مرکز تھا۔ علاقے کے سکھوں نے جیسا کہ ان کی روایت ہے، اپنی عبادت گاہ کو ایک قلعہ میں بدل ڈالا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے پاس کس قدر اسلحہ ہے۔ میجر اسلم، سیکنڈ لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر حسن ابدال پہنچے۔ ان کے پاس کچھ رائفلیں تھیں، ہلکی مشین گنیں اور چالیس سپاہی۔

افسروں نے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑا، گوردوارے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سکھ لیڈروں سے کہا کہ وہ ایک خصوصی ٹرین میں سوار ہونے کے لیے عمارت خالی کر دیں۔ ''ہم جان دے دیں گے اور گوردارہ خالی نہیں کریں گے۔'' انہوں نے صاف اور دوٹوک جواب دیا۔ سکھ اس علاقے میں مقیم رہنا چاہتے تھے اور اپنی عبادت گاہ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے، جہاں کبھی ان کے اولین گرو اور سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک نے قیام کیا تھا۔ اختر عبدالرحمٰن نے اپنے کمانڈر کو ٹھنڈے لہجے میں سکھوں سے کہتے سنا، ''آپ آج کی رات غور کر لیں، کل صبح سات بجے ہم دوبارہ آپ کے پاس آئیں گے۔ اگر آپ نے امن کے ساتھ عمارت خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ہم آپ کو وقار اور عزت کے ساتھ سرحد پار پہنچا دیں گے۔ دوسری صورت میں عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی اور آپ کو پتا چل جائے گا کہ پاکستانی فوج کے ساتھ لڑنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔''

اگلی صبح میجر اسلم اور لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمٰن نے سکھ سرداروں کے ساتھ چائے پی۔ بڑے اطمینان سے انہوں نے رائفلیں، بھاری مشین گنیں اور مارٹر توپیں پاکستانی افسروں کے حوالے کر دیں، جو بھارتی فوجی دستے پاکستان سے جاتے ہوئے ان کے حوالے کر گئے تھے۔ اگر انہیں ۱۴ سپاہیوں کے

ساتھ سکھوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔اس وقت کسے معلوم تھا کہ ایک دن نوجوان اختر عبدالرحمٰن ایشیا کی عظیم سیکرٹ سروس تعمیر کرنے میں بنیادی کردار ادا کرے گا اور اپنے دشمن کے خلاف سکھ کارڈ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کرے گا۔ کیا اس آدمی نے اس واقعے سے کوئی نتیجہ اخذ کیا، جو چیزوں پر سوچنے والا تھا۔ کیا اسے اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملی کہ اسلحہ کی کثرت بجائے خود جنگ کا فیصلہ کن کردار نہیں ہے اور دشمن کو دھوکے میں رکھ کر اور خوف زدہ کر کے اپنا ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیا فیصلہ کن مرحلے میں میجر اسلم کے ٹھنڈے اور پر اعتماد لہجے کا نقش اس کے ذہن پر ثبت ہوا ،کون کہہ سکتا ہے کہ آدمی کا ذہن کب کتنا حاضر ہوتا ہے اور کب کس چیز سے کتنا سیکھتا ہے۔لیکن اختر عبدالرحمٰن کی عسکری زندگی پر غور کیا جائے تو آشکار ہوتا ہے کہ ۲ فیلڈ رجمنٹ کی وابستگی کے سالوں نے ان کے عسکری انداز فکر پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ ان سالوں میں وہ جس طرح کے مناظر اور واقعات سے گزرے اور اس میں ان کے ساتھیوں اور خود انہوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا، بعد کے سالوں میں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، جیسے کوئی خواب دہرایا جا رہا ہو۔ کیا اس آدمی کو کبھی اس کا احساس ہوا کہ ایک عظیم الشان کردار ادا کرنے کے لیے جو سینکڑوں سال میں کسی فوجی افسر کو نصیب ہوتا ہے، قدرت انہیں حادثات اور معجزوں سے گزار رہی ہے۔

۲ فیلڈ رجمنٹ سے ان کی وابستگی کے اولین دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بازگشت برصغیر پاک و ہند کے عسکری اور سیاسی حلقوں میں سالہا سال تک سنائی دیتی رہی۔ باونڈری کمیشن کے امن قائم رکھنے اور انتقال آبادی میں مدد دینے والے ادارے کو جن پاکستانی دوستوں کی اعانت حاصل تھی، ان میں دو فیلڈ رجمنٹ بھی شامل تھی۔ اس رجمنٹ کے جوان اور افسر پوٹھوہار کے علاقے سے ہندوؤں اور سکھوں کو سمیٹ کر پرامن طریقے سے بھارت پہنچاتے رہے۔ جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ اس رجمنٹ کے سارے جوان مسلمان تھے۔ یہ سب کے سب تعلیم یافتہ بھی تھے اور اس رجمنٹ میں بھرتی کے لیے میٹرک کی سند ضروری تھی۔ معلوم نہیں یہ محض تجزیہ تھا یا کچھ اور، کہا جاتا ہے کہ برصغیر کی ہندوستانی فوج میں اس نوع کی دوسری کوئی رجمنٹ نہ تھی۔ تعلیم کی اس لازمی شرط کی وجہ سے جس کے لیے شاید کچھ خصوصی مراعات بھی دی گئی ہوں، جوانوں میں اکثریت کا تعلق فیروز پور، لدھیانہ، امرتسر اور جالندھر وغیرہ کے علاقہ سے تھا کہ اس علاقہ کے لوئر مڈل کلاس کسان اور چھوٹے مالکان اراضی کے گھرانوں میں تعلیم کا تناسب نسبتاً بلند تھا۔

تماشا یہ تھا کہ ایک طرف تو اس رجمنٹ کے جوان دشمن ملک میں جا آباد ہونے والوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑی حفاظت سے ان کے وطن میں پہنچا رہے تھے اور دوسری طرف ان کے آبائی علاقوں امرتسر اور جالندھر وغیرہ کی بہو بیٹیوں کو اغوا کیے جانے، گھروں کو نذر آتش کرنے اور اپنے نئے وطن کا رخ کرنے والے قافلوں پر آگ اور لوہے کی بارش کی خبریں رجمنٹ میں پہنچ رہی تھیں۔ مرنے اور کٹنے والوں میں ان کے عزیز و اقارت شامل تھے۔ کسی کو اس کے بھائی کے قتل ہونے کی اطلاع ملتی، کسی کو ماں کے زندہ جل جانے کی۔ کسی کی بہن کا سراغ نہیں مل رہا تھا اور کسی کے بچے کو کرپان میں پرو دیا گیا تھا۔ سخت فوجی نظم کے تحت زندگی گزارنے والے لوگوں نے ان زخموں کو سہنے، اپنی وردیوں اور بیرکوں میں خون کے گھونٹ پی کر تاب لانے کی کوشش کی، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ احتجاج جو بلند نہ ہو سکا، اور وہ اشک جو بہائے نہ جا سکے، آخر کار طوفان کا پیش خیمہ بنے۔ اگلے دنوں اس اضطراب نے برصغیر کی فوجی تاریخ کے دو حیرت انگیز واقعات کو جنم دیا۔ ایک واقعہ میں جانوں کے ضیاع کا کوئی خطرہ نہ تھا اور ہزاروں آدمی بھون ڈالے گئے۔ دوسرے میں تصادم یقینی دکھائی دیتا تھا، لیکن کسی کو خراش تک نہ آئی۔ ان دنوں واقعات کا مرکزی کردار لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمٰن تھے۔ ''توبہ، توبہ، توبہ''، رجمنٹ کے ایک سابق افسر نے اپنے کانوں کی لوؤں کو انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا، ''میں سوچتا ہوں تو لرز اٹھتا ہوں

کہ ہماری زندگیوں میں ایسی چیزیں بھی رونما ہو چکی ہیں اور وہ شخص لیفٹیننٹ اختر کس مٹی کا بنا ہوا تھا، چپ چاپ آنکھوں سے ہنستا ہوا، دفتر کی میز پر جھکا اور میدان میں بھاگ دوڑ کرتا ہوا، خطرات سے بھرے میدانوں میں وہ چیتے کی طرح تھا، آگ میں کود پڑنے والا لیکن حیرت انگیز منصوبہ ساز، خوف تو جیسے کبھی اس کی کھال میں داخل تک نہ ہوا تھا۔''

ریٹائرڈ حوالدار مرتضٰی کو وہ دن خوب یاد ہے، جواب راولپنڈی کی ایک فیکٹری میں لیبر افسر کے فرائض انجام دیتا ہے۔ پنڈ دادن خان کے مال دار ہندوؤں سے بھری ہوئی ریل گاڑی پتوکی ریلوے اسٹیشن پر روک دی گئی اور ہجوم نے اس پر حملہ کر کے ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا، حفاظتی گارڈ کے انچارج اختر عبدالرحمٰن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں اور بپھرے ہوئے ہجوم کا راستہ نہ روکیں۔ ''اگر حفاظتی دستے کو ہجوم کا راستہ روکنے کا حکم دیا جاتا، کیا وہ تعمیل کرتے؟'' مرتضٰی کا جواب نفی میں ہے، ''صاحب، ہم نے لاشوں سے بھری ہوئی گاڑیاں دیکھی تھیں۔ آئے روز ہمارے عزیزوں کے مرنے، لٹنے کی خبریں آتی تھیں۔'' جب پتوکی کے قریب مشتعل ہجوم نے گاڑی کو روکا اور فیصلے کا لمحہ آ پہنچا تو لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمٰن نے اپنا دل پتھر کر بنالیا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے، اپنی زندگی کے آخری سالوں تک وہ اس واقعہ کو یاد کرتے رہے اور انہیں اس کا کوئی ملال نہ تھا۔ ان کی رائے یہ محسوس ہوتی تھی کہ یہ تو ایک جنگ کی طرح تھا، جب ایک قوم کے لوگوں کو بے دردی اور سفاکی سے قتل کیا جائے، ان کی عورتوں کی آبروریزی کی جائے، اب کے بچوں کو سنگینوں سے چھیدا جائے اور ان کے بوڑھوں پر گھوڑے چڑھا دیے جائیں، تو اس سے دشمن کے معاملے میں رحم دلی کی امید نہیں کی جا سکتی، ہم نے ہجوم کو نہیں روکا۔'' انہوں نے 1987ء میں اس تاریخی رجمنٹ کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''ہم انہیں روکنا نہیں چاہتے تھے۔''

قتل و غارت کے بعد کی بھیانک خاموشی میں اختر عبدالرحمٰن پتوکی ریلوے سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بیٹھے تھے اور اپنے افسروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اچانک ایک ہندو فوجی افسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک دوسری گاڑی کے ساتھ آیا تھا۔ خون آلود مناظر نے اس کے اندر انتقام کا طوفان اٹھا دیا تھا اور وہ بدلہ لینے پر تلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اختر عبدالرحمٰن کمرے سے لپک کر باہر آئے۔ ''میں چار دیواری کے اندر بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔'' بعد میں اپنے دوستوں کو یہ واقعہ سناتے ہوئے، وہ ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا کرتے تھے۔ پلیٹ فارم پر وہ ہندو فوجیوں کے نرغے میں تھے۔ ہیجان میں مبتلا فوجیوں کے گھیرے میں آئے ہوئے کم گو ہیجان کا شکار نہ ہونے والے جواں سال افسر نے چیختے چلاتے دشمن کے جواب میں کوئی وضاحت پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بدلہ لینے کے خواہش مند لوگوں کے پاس تکرار کا زیادہ وقت نہیں تھا، چنانچہ ہندو افسر نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ وہ نشانہ لے کر گولی چلائے اور واقعہ کے ذمے دار کو قتل کر ڈالے۔ اسی لمحے، ٹھیک اسی لمحے ریکروٹ مرتضٰی عقب سے نمودار ہوا اور اس نے ہندو افسر پر رائفل تان کر کہا، ''اگر تم میرے صاب کو قتل کرو گے تو میں تمہارے صاب کو مار ڈالوں گا۔'' چہروں پر تنا ہوا انتقام کا رنگ خوف کے پیلے رنگ میں بدل گیا، مرتضٰی کے انتباہ پر گھیرا ڈالے ہوئے لوگ پیچھے ہٹتے ہوئے دور چلے گئے۔ لیفٹیننٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور مرتضٰی کو یاد ہے کہ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں ہیجان، اضطراب یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ لیفٹیننٹ کھلکھلا کر ہنس پڑا، جب مرتضٰی نے اسے بتایا کہ ہندو افسر پر تانی جانے والی اس رائفل میں ایک گولی بھی نہ تھی۔

میجر اسلم کے پاس ابھی رجمنٹ میں صرف دو افسر تھے، ان پر کام کا بوجھ لدا رہتا، بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ہنگامی احکامات موصول ہوتے اور حالات ابھی تک غیر یقینی تھے۔ اس رجمنٹ کو اس وقت ایک اور حادثے نے آ لیا، جب اس کا ہیڈ کوارٹر چکوال میں تھا، ایک بیڑی چکوال، دوسری سوہاوہ، اور

تیسری منڈی بہاوالدین۔ایک شام ایک جونیئر افسر نے، جو شام کو بیڑی کے جوانوں کی حاضری لگانے پر مامور تھا، میجر اسلم سے کہا کہ جب شام کو جوان ڈاک بنگلہ میں جمع ہوں تو ازراہ کرم وہ خود ہی حاضری لگانے کی زحمت کریں کہ جوان ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔سوال کرنے پر اس نے بتایا کہ یونٹ میں کچھ گڑبڑ ہے اور جوانوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔

جوانوں نے اپنے افسر کو بتایا کہ اس وقت جب وہ سکھوں اور ہندوؤں کو حفاظت سے بھارت پہنچا رہے ہیں، فیروز پور، لدھیانہ، امرتسر اور جالندھر سے ان کے عزیزوں کو ذبح کیے جانے کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔آخر وہ ایک ایسے وقت میں اس نوع کے فرائض کس طرح یکسوئی سے انجام دے سکتے تھے، جب ان میں سے بعض کے اہل خاندان قتل کے جا چکے ہیں اور باقیوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔جب باوردی جوان اپنا دکھ بیان کر رہے تھے، تو ان میں سے بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔جنرل اسلم کہتے ہیں، انہیں یوں لگا کہ اگر ان کے غم کا مداوا نہ کیا گیا تو شاید کچھ دن کے اندر وہ بغاوت کر دیں۔ماتحتوں کی بغاوت، ایک فوجی افسر کی پیشانی پر بدنما داغ۔

ضابطے کے مطابق انہیں اس سلسلے میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو لکھنا چاہیے تھا، جو مشترکہ کمیشن سے رابطہ کر کے خطرے میں گھرے ہوئے خاندانوں کو واپس لانے کے لیے ایک فوجی گروپ بھیجنے کی اجازت کا پرمٹ جاری کرتا۔وہ پہلے اپنے کرنل کو لکھتے اور وہ اپنے بریگیڈ سے بات کرتا، اس میں چھ سات ہفتے تک صرف ہو سکتے تھے۔اندیشہ تھا کہ اس عرصے میں منتظر لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا۔میجر اسلم نے اپنے ماتحت اختر عبدالرحمٰن سے مشورہ کیا۔ایک لیفٹیننٹ کے پاس اس ہیجان میں، اس قدر الجھے ہوئے مسئلے کا کیا حل ہو سکتا تھا، لیکن اس کے پاس ایک حل موجود تھا۔صاف اور انتہائی واضح الفاظ میں اس نے ایک منصوبہ پیش کیا۔''مجھے کچھ گاڑیاں اور جوان دیجئے۔''میں عام راستے سے ہٹ کر مشرقی پنجاب میں داخل ہوں گا۔فیروز پور، لدھیانہ، امرتسر اور جالندھر کے ان مہاجر کیمپوں میں جاؤں گا، جہاں ہمارے جوانوں کے عزیز و اقارب پناہ گزیں ہیں۔میں انہیں ان گاڑیوں پر لاد کر ایک ہفتے میں پاکستان لوٹ آؤں گا۔''سوال یہ تھا کہ وہ ضابطے اور اجازت کے بغیر، پرمٹ کے بغیر، ایک دوسرے ملک میں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔اختر کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا۔کئی فوجی گروپ دونوں ملکوں کے مہاجروں کو جمع کرنے اور سرحد پار بھجوانے میں مصروف تھے۔تبادلہ آبادی کے اس عظیم ہنگامے میں کس کو شبہ ہو گا کہ ایک گروپ بغیر پرمٹ کے سرحد پار چلا آیا ہے۔لے دے کر صرف سرحد پر ہی پرمٹ دیکھنے کا تکلف کیا جاتا ہے اور ۲ فیلڈ رجمنٹ کا یہ گروپ معمول کا راستہ اختیار نہیں کرے گا، لیکن کسی کو شبہ ہو سکتا ہے اور اس کا کوئی بھی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔تاہم خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔فوجی جواں اشک بار آنکھوں کے ساتھ سامنے کھڑے تھے اور رجمنٹ کی تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔

اپنے ہموار اور پریقین لہجے کے ساتھ ماتحت نے اپنے افسر کو قائل کر لیا اور کچھ ہی دیر میں وہ جوانوں کے سامنے کھڑے تھے۔انہوں نے بٹالین کو جس میں مشترکہ چیلنج نے ایک خاندان کی فضا قائم کر دی تھی، اپنا منصوبہ بیان کیا اور جوانوں سے کہا کہ جو لوگ لیفٹیننٹ کرنل کی قیادت میں اس خطرناک مشن پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہیں، وہ ایک قدم آگے آ جائیں۔وہ سب کے سب ایک قدم آگے بڑھ آئے، یونٹ کے خاکروب تک۔

سولہ چھوٹے اور بڑے ٹرکوں میں سوار ساٹھ جوان چکوال سے لاہور کے راستے بھارت روانہ ہوئے۔ان کے پاس رائفلیں اور چھ سات ہلکی مشین گنیں تھیں۔ان لوگوں کا انتخاب لیفٹیننٹ کرنل اختر عبدالرحمٰن نے کیا تھا۔میجر اسلم کو اندیشہ تھا کہ اس اقدام کے نتیجہ میں ان کا اور ان کے ماتحت کا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بھارت کی سرزمین پر یہ راز منکشف ہو گیا تو اس سے ملک اور فوج کی بدنامی ہو گی۔وہ یہ خطرہ محسوس

کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں وطن لوٹتے ہوئے مہاجروں کو قتل کر دیا جائے اور کیمپوں پر قیامت ٹوٹ پڑے۔لیکن دوسری طرف ایک فوجی افسر، ایک پاکستانی اور ایک انسان کی حیثیت سے وہ سوچتے تھے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔چیلنج اور خطرات کے سامنے بے بسی کا رویہ اختیار نہیں کر سکتے۔ان کا انداز فکر یہ تھا کہ بغاوت کے نتیجے میں ایک رجمنٹ برباد ہو جانے کے مقابلے میں ضابطوں کی خلاف ورزی کا جرم بہتر ہے۔

''جب اختر روانہ ہو رہا تھا، میں نے اس سے کہا کہ اگر کوئی پوچھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ پرمٹ کمانڈنگ افسر کے پاس چکوال میں موجود ہے اور یہ کہ اسے لازمی طور پر اپنا مشن سات دن میں انجام دینا ہے۔جب وداع کا وقت آیا تو وہ سنجیدہ اور پر اعتماد تھا اور اس نے صرف یہ کہا،''جناب! ہم جا رہے ہیں۔''جواب میں، میں نے کہا،''اللہ آپ کے ساتھ ہے۔''

''فوراً ہی چکوال میں انگریز کمانڈر بلڈلف کو اطلاع مل گئی اور اس نے مجھے طلب کر لیا۔اس کے ایجوٹنٹ کو میں نے جواب بھجوایا کہ میں 104 درجے کے بخار میں مبتلا ہوں، تین دن اس طرح گزرے کہ بلاوا آتا تو میں شدید بیماری کا بہانہ بنا کر تھوڑا سا وقت مزید حاصل کر لیتا۔سچی بات تو یہ ہے کہ ان سات دنوں میں جی رہا تھا، نہ مر رہا تھا۔''

آٹھویں دن اختر لوٹ آیا۔اس کے سولہ ٹرکوں میں سات سو سے زیادہ مہاجر سوار تھے۔ان میں فوجیوں کے کنبوں کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ بھی تھے۔ٹرکوں کے اندر جگہ نہ رہی تو اطراف میں ہکوں پر تختے جمائے گئے اور لوگ ان پر اکڑوں بیٹھ گئے۔اس نے بتایا کہ وہ واہگہ کے قریب ایک ایسے راستے سے بھارت میں داخل ہوا، جہاں کسی سے ان کی مڈبھیڑ نہ ہوئی۔مشرقی پنجاب کے اضلاع میں بلوچ رجمنٹ کے سوا، جو سرکاری انتظامات کے تحت مہاجروں کی حفاظت اور واپسی کے فرائض انجام دے رہی تھی، اس کا کسی سے آمنا سامنا نہ ہوا۔حیرت انگیز طور پر اس پورے سفر میں ایک ٹرک بھی خراب نہ ہوا۔

سرما کے موسم میں فوجی جوانوں کے کنبوں کے سوا باقی مہاجروں کے لیے راولپنڈی میں ایک کیمپ لگایا گیا۔فوجی سٹوروں سے راشن چوری کیا گیا، جوانوں اور افسروں نے اپنی تنخواہوں سے عطیات دیے، زیادہ تر نے اپنی نصف تنخواہ غیر سرکاری طور پر قائم کیے گئے فنڈ میں جمع کرا دی۔شہریوں کے دروازے کھٹکھٹا کر کمبل اور رضائیاں جمع کی گئیں، میجر اسلم کی بٹالین سے آٹے کی دس بوریاں مہاجروں کو پہنچائی گئیں۔

کرنل بلڈلف خدا ترس آدمی تھا، وہ معذوروں اور بیماروں کی مدد کرتا دکھائی دیتا تھا، لیکن ضابطے کی ایسی سنگین خلاف ورزی کیسے برداشت کر لیتا۔آخر کار میجر اسلم راولپنڈی پہنچے، جہاں ان کے برادر نسبتی (بعد میں بریگیڈئر) راجہ عنایت ان کے ایجوٹنٹ تھے۔بریگیڈئر بلڈلف نے سر اٹھا کر سہمے اور مضطرب میجر کو دیکھا اور کہا،

If i dont take action against you , i am not doing my duty . If i court martial you then i will be ruining the career of a very good officer .

(اگر میں تمہارے خلاف کارروائی نہیں کرتا تو میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کروں گا۔اگر تمہارا کورٹ مارشل کروں، تو میں ایک ایک نہایت عمدہ افسر کا کیریئر تباہ کر دوں گا۔)

میجر اسلم نے انگریز کرنل سے کہا کہ وہ ان کی اجازت سے اپنے اقدام کی وضاحت کرنے کے خواہش مند ہیں۔انہوں نے ایسا کیا اور پھر مودب ہو کر سوال کیا،''سر، اگر آپ ایسی صورتحال سے دوچار ہوتے تو کیا کرتے؟''قدرے تامل کے بعد انصاف پسند آدمی کی آواز میں نرمی آ گئی اور اس نے

کہا،''ہاں، میں وہی کرتا، جو آپ لوگوں نے کیا۔'' لیکن پھر فوراً ہی اس نے کہا،''میں دوسری بار آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' میجر اس وقت کمرے سے باہر نکل رہے تھے، جب کرنل بلڈوف نے انہیں کہا کہ اس حیرت انگیز لیفٹیننٹ کو اس کارنامے پر ان کی طرف سے مبارکباد کا پیغام پہنچا دیں۔

اس حیرت انگیز لیفٹیننٹ نے وہ کارنامہ کس طرح انجام دیا، جس کا بہت دن فوج میں چرچا ہوتا رہا۔ راولپنڈی پہنچ کر اسے اپنے کارنامے کی تفصیلات بیان کرنے اور داد پانے سے زیادہ تھکن اتارنے کی فکر نے آ لیا تھا۔ وہ یوں بھی کم گو آدمی تھا اور جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے تفصیلات بیان کرنے کی بجائے کم سے کم لفظوں میں جواب دینے پر اکتفا کیا۔''ہم سوئے بغیر چلتے رہے۔'' اس نے کہا،''کیونکہ ہمارے پاس وقت تھا ہی نہیں، اس لیے ہم نے معمول کے کھانے سے احتراز کیا۔ ہمارے پاس جو چنے اور گڑ تھا، ہم نے اس پر گزارا کیا، یا ان پھلوں پر جو وقت صرف کیے بغیر راستے سے خریدے جا سکے۔ ہم نے صرف فوجیوں کے لواحقین کو ٹرکوں میں جگہ نہیں دی، بلکہ کسی دوسرے کو بھی انکار نہیں کیا۔'' مختصر سی روداد بیان کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں سونے چلا گیا، جہاں وہ تنہا رہتا تھا کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اکڑ کر نہیں چلا، نہ اس نے بڑ ہانکی۔ اس کے برعکس ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ اپنی ماں کے سکھائے سبق اور اپنے خواب کے بارے میں۔ اس کے خاندان کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس کا ملک ایک ہنگامے سے دوچار تھا، اور جنگ سر پر کھڑی تھی۔ ایسے وقت میں، وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتا تھا؟